فیمینزم اور اینٹی فیمینزم: توازن کی تلاش

Feminism and Antifeminism: In Quest of Balance

[1] شاہد حسین [2] ڈاکٹر مظہر عباس

Abstract:

Feminists, who proclaim to be the representatives of women rights, are of the view that feminine notions, likes a woman is fragile, weak and venerable to panic, are not by her birth rather these are attached to her by patriarchal society. Therefore, a woman's gender is socially constructed. On the other side, anti-feminists try to prove above noted feminine traits scientifically and psychologically. Thus, manifest the idea that a woman's gender is biologically defined. This study endeavors at paving a mid and agreeable way between these two-confronting frames of minds by stressing the commonly shared and agreed upon notions.

Keywords: Sex, Gender, Patriarchy, Socially Constructed, Biological Changes

کلیدی الفاظ: جنس، صنف، پدر سری نظام، سماجی تشکیل، حیاتیاتی تبدل، ارتقائی بہروپ

عہد حاضر کے چند ایسے مباحث جن سے کسی طرح صرفِ نظر ممکن نہیں ان میں تانیثیت بھی شامل ہے۔ یہ سچ ہے کہ تانیثیت ہر عہد اور جغرافیہ میں حالات کے ساتھ اپنی شکل بدل لیتی ہے۔ تاہم ایک چیز جو ہر شکل میں یکساں ہے وہ یہ دعویٰ کہ عورت مرد کی مردانگی کا شکار ہے؛ شکار کرنے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ایک بات مسلمہ ہے کہ شکاری ایک ہی ہے۔ ہر دور میں عورت کو پست جان کر اس کا استحصال کیا گیا اور اسی استحصال ہی کی وجہ سے یہ سوچ، جسے فیمینزم کا نام دیا گیا، پیدا ہوئی کہ اس رویے سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ دوسری طرف اینٹی فیمینیسٹ ہیں جو مرد اور عورت کو حیاتیاتی نقطہ ءِ نظر سے دیکھتے ہیں اور عورت کو کمزور ثابت کرنے کے بعد، وجہ فطرت کو قرار دیتے ہیں، جس نے اسے کمزور اور کم تر پیدا کیا ہے۔ گویا مرد و عورت میں ایک نظریاتی جنگ جاری ہے۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ اس جنگ کی بنیادی وجوہ کیا ہیں؟ اس کی نوبت کیوں پیش آئی؟ اور فریقین کے مطالبات و نظریات میں کوئی توازن کی راہ نکلتی ہے یا نہیں۔ ذیل میں انہی سوالات کے جوابات کھوجنے کی سعی کی جائے گی۔

---

۱ پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

۲ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

تانیثیت کے ہر طرح کے مباحث پر بحیثیت مجموعی نگاہ کی جائے تو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ یہ اپنی ہر سطح پر مرد اساس سماج (Patriarchy) ہی کے خلاف بر سر پیکار ہے۔ تانیثیت کے نزدیک پدر سری نظام (Patriarchy) کیا ہے اور اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ دراصل تانیثیت کی پہلی لہر کا مقصد جنس کی بنیاد پر قانونی اور سیاسی مساوات کا حصول تھا اور یہ ووٹ کا حق ملنے پر پورا ہو گیا، یعنی سیاسی دائرہ کار میں اب کوئی استحصال نہ تھا کہ مرد اور عورت دونوں کو برابری کی سطح پر ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ ان متحرک فیمینیسٹ خواتین کو یقین تھا کہ اگر سیاسی میدان میں انہیں مساوی حقوق مل جاتے ہیں تو باقی سماجی، معاشی اور تعلیمی میدان میں ان کو خود بخود مساوی حقوق مل جائیں گے، اس لیے انہوں نے اپنی پہلی ترجیح سیاسی حقوق کے حصول یعنی ''ووٹ کے حق'' کو دی۔[1] اس حق کا حصول ممکن بھی بنایا، مگر ان کا یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا؛ مثلاً تانیثیت کی پہلی لہر کے بعد عورت کو ملازمت کے مواقع تو میسر آئے لیکن محدود شعبہ جات میں یعنی خواتین کو ہر شعبۂ ہائے زندگی میں مرد کے مساوی ملازمتیں نہ دی گئیں۔ عورت کو اس کی ''مروجہ'' طبیعت کے لحاظ سے ملازمت دی جاتی۔

عام خیال تھا کہ عورت کمزور، دیکھ بھال کرنے والی یا پرورش کرنے والی خصوصیات رکھتی ہے اس لیے اسے ایسی ہی ملازمت دی جائے جیسے نرس یا ٹیچر۔ تاہم کوئی عورت اگر انجنیئر، کاروبار یا سیاست کو بطور پیشہ اپنانا چاہتی ہے تو اس کے لیے یہ دروازے بند تھے۔ اس طرح دیکھیں تو جنس کی بنیاد پر معاشی استحصال اب بھی موجود تھا۔ اسی طرح عورتوں کو تعلیم کے مواقع تو ملے، ان کے لیے الگ سکول بھی بنائے گئے، مگر مضامین کے آزادانہ انتخاب کا حق انھیں حاصل نہ تھا۔ وہ صرف گنے چنے مضامین میں داخلہ لے سکتی تھیں اور ان مضامین کا انتخاب بھی عورت کے حوالے سے عمومی تصور کو ملحوظِ خاطر رکھ کر کیا جاتا تھا۔ جبکہ مردوں کو جہاں من پسند مضامین کے انتخاب کا حق حاصل تھا وہیں عورتوں کا بلحاظ جنس تعلیمی میدان میں بھی استحصال ہو رہا تھا۔ یوں تانیثیت کی بنیاد گزار خواتین کا مساوی حقوق کے حصول کے حوالے سے قائم یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا، کیوں کہ حق رائے دہی میں برابری ملنے کے باوجود عورت کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی میدان میں برابری ابھی نہیں ملی تھی۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر تانیثیت کی تحریک نے ایک بار پھر سر اٹھایا اور اب کی بار عورت کے استحصال کی بجائے جبر (Oppression) کی بات کی گئی۔ اس بار آواز اٹھائی گئی کہ عورتوں کا صرف استحصال ہی نہیں ہوتا بلکہ ان پر جبر بھی ہوتا ہے۔[2] ہم عام طور پر جبر اور استحصال کو مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دراصل یہ جبر اور استحصال ایک طرح کی رکاوٹیں ہیں جن میں ایک کا تعلق خارج سے ہے تو دوسری کا تعلق داخل سے۔ استحصال کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی قانون موجود نہیں ہے تو اس کی مانگ کر کے قانون تشکیل دیا جائے۔ نمائندگی نہیں تو اس کے لیے احتجاج کیا جائے، ملازمت کے مواقع نہیں تو ان کے پیدا کرنے کے مطالبات رکھے جائیں وغیرہ۔ ان تمام چیزوں کا تعلق بیرون یعنی خارج سے ہے جبکہ جبر کا تعلق انسانی رویّوں، ذہنیت، اعتقادات، روایات اور کلچر سے ہے۔ یہ چیزیں سامنے نظر نہیں آتیں لہٰذا ان کا تعلق انسان کی داخلیت سے ہے۔ اور سماج میں یہ تمام چیزیں مل کر نہ صرف عورت کو ایک ماتحت کے رکھتی ہیں بلکہ اسے درست بھی مانتی ہیں۔ لہذا ان کو تبدیل کرنا اتنا آسان نہیں۔ استحصال میں تو چیزیں سامنے نظر آتی ہیں ان کو قانون اور اصلاحات لا کر بدلا جا سکتا ہے مثلاً مرد کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے تو یہاں عورت کا استحصال ہو رہا ہے کہ اس کو ووٹ دینے کا حق نہیں، لہذا عورت کو بھی ووٹ دینے کا حق دیا جائے، اور مل بھی گیا تو سامنے پورا ہوتا ہوا نظر آ گیا لیکن انسانی رویّوں، ذہنیت، اعتقاد، روایات و کلچر سامنے کی چیزیں نہیں ہیں ان کو ہم کوئی قانون یا اصلاحات لا کر بدل نہیں سکتے کیوں کہ یہ داخلی رکاوٹیں ہیں۔ اب یہاں فیمینیسٹ خواتین کے سامنے بڑا سوال یہ تھا کہ پھر اس کا حل کیا ہے؟ ان کو کیسے بدلا جائے؟

تانیثیت کی دوسری لہر اپنی نوعیت میں ایکٹیوسٹ (Activist) سے زیادہ نظریاتی تھی۔[3] اس سے متعلق متحرک خواتین کا کہنا ہے کہ سماج میں بہت سی سیاسی، سماجی اور معاشی ساختیں ہیں جو داخلی رکاوٹوں کو پیدا کرتی ہیں۔ اب ضرورت اس کی تھی کہ ان کو کھولا جائے لہٰذا ان ساختوں کو توڑنے یا کھولنے کے لیے انہیں نئ تھیوریوں اور اصطلاحات و طریق کار کی ضرورت تھی، جس سے وہ عورتوں کے مسائل کو ایک نئے طریقے سے بیان کر سکیں۔ لہٰذا ان کا زیادہ وقت ان نظریات کی کھوج میں گزرتا ہے۔۔ گویا تانیثیت کی نئ نئ اصطلاحات سامنے آتی ہیں مثلاً (Patriarchy, Gender and sex distinction Public Private Divide) اپنے دوسرے دور یا دوسری لہر میں تانیثیت کو ایک تعلیمی فیلڈ کے طور پر رکھا جاتا ہے۔

اس میں ریسرچ ہوتی ہے، مفروضے بنتے ہیں اور تجربات ہوتے ہیں۔ یوں سب سے بڑا الزام پدر سری نظام (Patriarchy) کے سر آیا کہ سب جبر کی اصل جڑ یہی ہے۔ اس جبر (Oppression) کو لے کر نئی نئی اصطلاحات و نظریات سامنے آنا شروع ہوتے ہیں۔ ان فیمینیسٹ خواتین کا کہنا ہے کہ زندگی کے تمام شعبہ جات مثلاً سماجی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی وغیرہ پر مرد برتری اور مرد بالادستی قائم ہے، جسے ان بابت معلومات حاصل کر کے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اب ان فیمینیسٹ خواتین کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ عورت پر ہو رہے اس جبر کی اصل جڑ پدر سری نظام (Patriarchy) ہے۔ اب ان کے لیے اگلا مسئلہ ان عناصر کی تلاش تھی جس پر یہ قائم ہے اور کون سا طریقہ ہے جس پر یہ خود کو برقرار رکھتی ہے۔ تا کہ ان کا قلع قمع کیا جا سکے۔ تو تب انہوں نے دیکھا کہ اس کی بنیاد مرد اساس معاشرے نے دو چیزوں پر رکھی ہے کہ:

۱۔ جنس(Sex)اور صنف(Gender) کو آپس میں ملا دیا گیا، لہٰذا اسے جدا کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ عورتوں کو سرکاری دائرہ(Public Sphere) کے بجائے نجی دائرہ(Private Sphere) تک محدود رکھا۔ لہٰذا اب ان دائروں کو توڑنے کی ضرورت ہے۔

ان فیمینیسٹ خواتین کا کہنا ہے کہ پوری دنیا میں جہاں بھی عورت ہے وہ مرد برتری اور جبر کے تجربات رکھتی ہے یا محسوس کرتی ہے لہٰذا ان مشترک تجربات کی بنیاد پر عورتیں ایک ''سماجی کلاس'' مشترکہ گروپ یا(Sisterhood) بناتی ہیں۔[4] یوں مطالبہ ہوا کہ عورت کو ایک واحد نہیں بلکہ ایک گروپ کی طرح دیکھا جائے۔ کسی گروپ کی تشکیل میں ایک مشترک چیز کا ہونا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ عورتیں مرد برتری اور جبر کے احساس کا مشترک تجربہ رکھتی ہیں اس لیے انہیں مشترک گروپ(Sisterhood) سمجھا جائے۔ اور اس گروپ کو مردانہ سماجی اقدار اور ادارہ جات سے آزاد کرایا جائے۔ اس طرح تانیثیت کی دوسری لہر وومن لبریشن موومنٹ(Women's Liberation Movement) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔[5]

ان کے اہم مطالبات اور نظریات یہ تھے کہ سماجی نظام کو تشکیل دینے، چلانے اور کنٹرول کرنے کے لیے جن بھی اصول و نظریات کو بنایا گیا ہے وہ مرد کے بنائے ہوئے ہیں اور ان اصول و نظریات کو بناتے ہوئے مردوں نے عورتوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھا۔ لہٰذا مرد اساس سماج میں عورتیں اپنے حقوق کی بات

نہیں کر سکتیں کیوں کہ پورا نظام فکر، اصول و نظریات اور اصطلاحات عورت نے نہیں بلکہ مرد نے بنائے ہیں جو عورت کی بجائے مردانہ دلچسپیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔اس لیے ان موجودہ اصول و نظریات اور اصطلاحات کا استعمال کر کے عورت اپنے حقیقی جذبات و احساسات کا اظہار نہیں کر سکتی۔اس لیے انہوں نے اپنے لیے نئی اصطلاحات اور اصول و نظریات کی ضرورت پر زور دیا۔

یوں سب سے پہلے سیمون ڈی بوا نے اپنی کتاب ''The Second Sex'' میں پدر سری نظام کو چیلنج کیا۔وہ کہتی ہیں کہ :

> "One is not born, but rather becomes a Woman" [6]

این۔اوکلے (Ann Oakley) نے اس اختلاف سے متعلق تفصیل سے بات کی۔اس کے نزدیک صنف (Gender) اور جنس (Sex) دو الگ اصطلاحات ہیں۔اس نے اپنی کتاب (Sex, Gender and Society (2015) میں بیان کیا:

> "Sex, is a word that refers to biological differences between male and female: the visible difference in genitalia, the related difference in procreative function. Gender, however, is a matter of culture: it refers to the social classification into 'masculine' and 'feminine'. [7]

وہ بتاتی ہیں کہ صنف (Gender) کا تعلق کلچر سے ہے جبکہ جنس (Sex) کا تعلق مرد اور عورت کے درمیان بائیولوجیکل فرق سے ہے۔اگرچہ یہ دونوں اصطلاحات عام طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ میں استعمال ہوتی ہیں تاہم جنس اور صنف میں واضح فرق ہے۔ جنس سے مراد مرد اور خواتین کے درمیان حیاتیاتی اور جسمانی اختلافات ہیں جبکہ صنف سے مراد مرد اور عورت کے مابین سماجی اختلافات ہیں۔یہاں سوال یہ پیدا ہوا کہ بائیولوجیکل اختلافات تو قدرتی ہیں یہ سماجی اختلافات کون پیدا کرتا ہے؟ تو اس کا سیدھا سا جواب تھا سماج۔تانیثی فکر کی حامل خواتین کا ماننا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی جنس کے ساتھ کچھ ایسے کردار اور خاصیتیں جوڑ دی جاتی ہیں کہ اگر لڑکا ہے تو اسے مضبوط بننا ہے، سخت اور عضیلہ ہونا ہے۔وہ نہ جھاڑو دے سکتا

ہے، نہ برتن دھو سکتا ہے۔ اسے خاص لباس پہننا ہے اور کما کر لانا ہے۔ اسی طرح اگر لڑکی ہے تو اسے نرم و نازک ہونے کے ساتھ کمزور سمجھا جائے گا۔ وہ گھریلو چولہے چوکے کے کام سنبھالے گی اور بڑی ہو کر خاوند کی خدمت کر کے اطاعت شعار بیوی کہلائے گی۔ فیمینیسٹ مفکرین کا خیال ہے کہ صنف(Gender) کی بنیاد پر عورت استحصال اور جبر کا شکار ہے۔ عورت کو ایسے کردار عطا کیے گئے جو مرد کے ماتحت ہیں یا اس سے کمتر ہیں۔ یعنی اگر لڑکی ہے تو اسے کمزور اور اگر لڑکا ہے تو اسے مضبوط ہونا ہے۔ یوں سماج جب خود ساختہ نسائی خصوصیات کو صنف(Gender) اور جنس(Sex) سے یعنی نسائی علامات (Feminine Traits) کو اس کی جنس (Sex)یعنی (Female) سے ملاتا ہے تو وہ اسے ایک صنف (Gender) یعنی (Woman)بناتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب آپ کے سماجی کردار یا خصوصیت کو آپ کی بائیولوجیکل شناخت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک نئی اصطلاح جنم لیتی ہے جسے(Gender) کہا جاتا ہے۔ لہٰذا جب سماج کہتا ہے کہ آپ فیمیل یا میل ہیں اور آپ میں اپنی متعلقہ خصوصیات ہی ہونا چاہییں تو تب سماج دراصل کسی فرد کے مستقبل کو(Determine) کر رہا ہوتا ہے، کہ اسے کیسا ہونا چاہیے۔ اسی کو بائیولوجیکل ڈی ٹرمینیزم Biological (Determinism) کہتے ہیں۔[8] اور پدر سری سماج اسی بائیولوجیکل ڈی ٹرمینیزم پر بنیاد رکھتا ہے۔

یہاں چند بنیادی سوالات جنم لیتے ہیں۔

۱۔ کیا صنف(Gender) واقعتاً مکمل طور پر سماج کی پیداوار ہے۔

۲۔ کیا صنف(Gender) واقعتاً مکمل طور پر بائیولوجیکل(Biological) ہے۔

صنف (Gender) سماج کی بنائی گئی تصویر یا شکل ہے، اس پر کافی بحث ہو چکی، لیکن یہ سماج کی پیداوار نہیں بلکہ بائیولوجیکل ہے اس نظریے کے حامیوں کے بارے جانتے ہیں۔ پروفیسر سائمن کوہن نے تحقیق کی ایک سیریز کے بعد یہ کہا ہے کہ:

> "In the largest study to date of autistic traits, we test 10 predictions from the Empathizing_Systemizig(E-S) theory of sex difference and the Extreme Male Brain (EMB) theory of autism. We confirmed that typical female on average are

> more emphatic, typical male on average are more systems-oriented, and autistic people on average show a 'masculinized" profile."[9]

پروفیسر سائمن کوہن اپنی تحقیق میں یہ بھی کہتی ہیں کہ ماں کے پیٹ ہی میں مرد اور عورت کے دماغ مختلف نشوونما پانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر رحم مادر میں ٹیسٹا سٹیرون ہارمون کی مقدار زیادہ ہو تو دماغ میں معلومات کے آپسی تعلقات کو جوڑنے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت زیادہ ہو جاتی ہے ایسے بچے کا دماغ منطق کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، ایسا دماغ، مردانہ دماغ ہے۔اور اگر اس ہارمون کی مقدار کم ہو تو ایسے دماغ میں جذبات کو سمجھنے اور تخلیقی صلاحیت بڑھ جاتی ہے، ایسا دماغ، زنانہ دماغ ہے۔[10]

یونیورسٹی آف پینسلونیا میں ہونے والی ایک تحقیق میں 'امیج ٹیکنیک' استعمال کی گئی۔ راگنی ورما اس تحقیق سے منسلک تھیں اور انکا کہنا ہے کہ دماغوں کے جائزے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ مرد و خواتین کے دماغوں میں بہت واضح فرق ہے۔ جس طرح سے مرد کا دماغ بنایا گیا ہے عورت کا دماغ ویسے نہیں بنایا گیا۔ اسی لیے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کیوں چند امور مرد زیادہ بہتر طور پر انجام دیتے ہیں اور چند امور میں خواتین مردوں سے کیوں آگے ہیں؟ اس تحقیق میں مجموعی طور پر ۹۴۹ یعنی ۴۲۸ مرد اور ۵۲۱ خواتین کی ذہنی سرگرمیوں کا جائزہ بذریعہ(DTI Imaging)لیا گیا۔ خواتین کے دماغ میں(Cerebrum)یعنی دماغ کا سب سے بڑا حصے میں اس کے دائیں اور بائیں حصے کے درمیان زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ جو ان میں ہمدردی، سماجی زندگی کے امور اور نشوونما جیسی خصوصیات و رویہ جات کے پنپنے کا باعث ہے۔[11]جب کہ دوسری طرف مردوں کے دماغ میں سیر یبرم کے دونوں حصوں کے آپسی تعلقات کی بجائے پچھلے حصے سیری برل ہیمی سفیر سے زیادہ رابطہ پایا گیا جو کہ ان اعضاء سے منسلک افعال کی بدولت مردوں میں جسمانی افعال (Motor Skill)اندازہ لگانا، خطروں کی پہچان اور حفاظت کرنے ایسے جذبات و رویہ جات جنم لیتے ہیں۔ اس لیے مردوں کو فزیکل کام زیادہ کرنے پڑتے ہیں تا کہ وہ آنے والے خطرات سے بچوں اور عورتوں کو بچا کر اپنی نسل کی بقا کی جنگ لڑ سکیں۔

عام مشاہدے کی بات ہے فیمیل عام طور پر سوشیالوجی، سائیکالوجی، بچوں کی نشوونما جیسے کورسز میں زیادہ داخلہ لیتی ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عورت کی اس جبلت جو کہ دوسروں کی مدد کرنا، نشوونما وغیرہ کی عکاس ہے۔ ان پر کسی قسم کا سماجی دباؤ نہیں ہوتا۔ یہ ان کا ذہنی میلان ہے چونکہ ان کورسز میں سماجیت، ہمدردی اور نشوونما سلیبس کا حصہ ہے جو عورتوں کی طبیعت سے میل کھاتا ہے۔ مزید اگر ہم ملین ڈالرز کی بیوٹی انڈسٹریز کو دیکھیں تو یہاں عورتیں ہمیں خود یہ بتاتی نظر آتی ہیں کہ وہ مردوں سے مختلف ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مخالف جنس کے لیے دلکش اور جاذب نظر بناتی ہیں۔ یہ فقط سماجی تشکیل نہیں کہ عورت ہے تو خوبصورت ہی ہو۔ یہ عورت کا خود کو مرد کے لیے باعث کشش بننے کی ایک کاوش ہے جو اسے مرد سے مختلف کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بارڈر پولیس یا فوج یا آگ بجھانے کے سکواڈ میں عورتیں عام طور پر شرکت نہیں کرتیں۔ یہ کام مرد کی فطرت میں ہیں اور اس کے جسم میں شامل ہارمونز اسے ان خطرات کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کے قابل بناتے ہیں کیوں کہ حفاظت کرنا مرد کی جبلت میں شامل ہے۔

اسی طرح ولیم ریولی کا بھی کہنا ہے کہ صنف سماج کی تشکیل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ :

> ''مرد اور عورت مختلف ہیں اور یہ اپنی ابتدائی عمر سے ہی مختلف رویے اور میلان رکھتے ہیں۔ بلحاظ جنس ان کی مختلف کھلونوں اور کھیلوں میں دلچسپی ان کے مختلف ہونے کی دلیل ہے کیوں کہ لڑکے عام طور پر متشدد، بے ترتیب، خلل انگیز اور مسلسل جدوجہد والے کھیل اور متعلقہ کھلونوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ جبکہ لڑکیاں عام طور پر پرورش، چیزوں کی حوصلہ افزائی اور نگہداشت سے متعلقہ کھیل اور کھلونوں میں دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ اور یہ تبدیلی جانداروں کی مختلف انواع میں دیکھی گئی ہے''[12]

لیکن تانیثیت پسند عورت پر ظلم و ستم کا ذمے دار انہی دقیانوسی خیالات کو ٹھہراتی ہیں جنھوں نے عورت کو قدرتی طور پر مفلوج، کمزور اور کند ذہن کہا ہے۔ جیسا کہ سقراط نے عورت کے متعلق کہا تھا کہ عورت سے زیادہ فتنہ و فساد کی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے جس مسئلہ پر غور و فکر کیا اس کو گہرائیوں تک آسانی سے پہنچ گیا لیکن آج تک میں عورت کی فطرت کو سمجھ نہیں سکا۔ افلاطون نے کہا تھا کہ سانپ ڈسنے کا علاج تو موجود ہے لیکن عورت کے شر کا علاج ممکن نہیں۔[13] اور ارسطو کا کہنا تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان ایک قدرتی رشتہ

برتر سے کمتر اور حاکم اور محکوم کا ہے۔عورت کی پیدائش نامکمل حمل کے نتیجے میں ہوئی تھی اس لیے وہ ناقص العقل اور ادھوری ہے۔[14]اسی طرح تھامس جیفرسن جو کہ امریکہ کے بانیوں میں سے ایک ہیں انہوں نے عورت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا کہ عورت کی جگہ گھر میں ہے سرکاری دفاتر اور سیاست میں نہیں پھر ایک مشہور سائنسدان چارلس ڈارون نے تو بائیولوجیکلی اپنے نظریات میں کہا کہ ''مرد بلحاظ ذہانت عورت سے برتر ہے۔''[15]یعنی وہ تمام کام جہاں وجوہ، تخیل یا دماغی صلاحیت کا استعمال کرنا ہوتا ہے وہ مرد ہی اچھی طرح سے کر سکتے ہیں۔

لیکن سوال یہاں یہ ہے کہ اپنے سماجی، جنسی اور معاشرتی رویّوں میں مرد و عورت کے علاوہ کئی اور نام بھی شہرت پا چکے ہیں۔اگر ان سے متعلق بات نہ ہو تو تشنگی باقی رہے گی کہ ان پر کون سے ہارمونز یا جنیٹک کوڈ اثر انداز ہوتے ہیں؟ یہ بھی سماج کے تعمیر شدہ ہیں یا بائیولوجیکل؟ ہمارے ہاں اکثر ان سب کو تیسری مخلوق کہہ کر بات آئی گئی کر دی جاتی ہے۔ان کی بھی بہت سی شکلیں ہیں جن میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:۔

LESBIAN: اس سے عام طور پر وہ عورت مراد ہے جو مرد کی بجائے عورت سے رومان یا جنسی میلان رکھتی ہو یا خواہشمند ہو۔

GAY: اس سے عام طور پر وہ مرد مراد ہے جو عورت کی بجائے مرد سے رومان یا جنسی میلان رکھتا ہو یا خواہشمند ہو۔

BISEXUAL: ایسا فرد جو جنسی، رومانوی، طبعی یا روحانی طور پر ایک سے زیادہ اصناف میں دلچسپی لیتا ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سب ایک ہی وقت، ایک ہی جگہ یا پیمانے پر ہو۔

TRANSGENDER : ایک ایسا فرد جس کی اپنی ذاتی شناخت یاGENDERاس کے اُس(SEX) سے میل نہ کھاتے ہوں جو پیدائش کے وقت اسے دیا گیا تھا۔

QUEER: یہ ایک کثیر الجہت اصطلاح ہے جو مختلف لوگوں کے لیے مختلف طریقوں سے، مختلف معنی رکھتی ہے۔ یعنی یہ ایک عام اصطلاح ہے جوQUEERمخالف جنس پسند (Heterosexual)لوگوں کے علاوہ سب کے لیے بولی جاتی ہے۔

QUESTIONING GENDER: وہ فرد جسے اپنی جنسی رغبت، اپنی ذاتی شناخت یا Gender پر یقین نہ ہو یا اس کی دریافت میں ہو۔

INTERSEX: یہ بھی ایک کثیر الجہت اصطلاح ہے۔ جو SEX سے متعلق تین خصوصیات مثلاً کروموسومز، گونیڈز، جنسی رطوبتوں وغیرہ میں اختلاف یا پیدائشی طور پر نہ ہونے کے باعث میل اور فیمیل کے علاوہ نام پاتے ہیں۔

ASEXUAL: ایسا فرد جو جنسی تعلقات یا رویہ میں بالکل دلچسپی نہ رکھے یا بہت کم رکھے۔ وہ کسی بھی قسم کے جنسی جذبات کو، چاہے وہ طبعی ہوں سماجی یا رومانوی محسوس نہیں کرتا۔ یہ برہمچاری (Celibacy) یعنی سماجی یا مذہبی روایات کے دباؤ میں ساری عمر کنوارا رہنا اور اپنے جنسی جذبات کو خود مارنا، سے الگ ہے۔ کہ اس کا تعلق جنس (Sex) سے ہے نہ کہ اپنی پسند پر۔

AROMATIC: ایسا فرد جو کسی بھی صنف سے انتہائی کم یا بالکل بھی رومانوی کشش نہ رکھے یعنی اس کی رومانوی رویہ یا تعلقات میں دلچسپی ہی نہ ہو۔

PANSEXUAL: ایسا فرد جو صنفی شناخت رکھنے والے ہر طرح کے افراد کے ساتھ جنسی، رومانوی، طبعی اور روحانی کشش رکھے۔

NON-BINARY: ایسا فرد جو مرد اور عورت کی ثنوی صنفی شناخت پر پورا نہ اترے ان کے لیے یہ اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔

AGENDER: ایسا فرد جو اصناف پر یقین نہیں رکھتا جو مرد اور عورت کی صنفی پہچان کو نہیں مانتے اور Gender کے بغیر رہتے اور رہنا چاہتے۔ مزید Genderless معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں۔

STUD: ایسا فرد جو بلحاظِ جنس مرد ہو لیکن جنسیت اور صنفی سماجی تشکیلی مباحث کے مطالعہ میں اسے عورت کے کردار دیئے جائیں۔ تب یہ زیرِ مطالعہ فرد STUD کہلاتا ہے۔[16]

تانیثیت کے مخالفین کا کہنا ہے کہ جیسے ہم کسی ایک لفظ کی تعریف کو بدل کر کل بیانیے کو اپنی سمت نہیں کر سکتے بالکل ایسے ہی معاشرے نے عورت اور مرد سے متعلقہ بائیولوجیکل خصوصیات پر مرد اور عورت کی الگ الگ خصوصیات یا رویہ جات کے پیمانے بنا رکھے ہیں۔ یہ ایک عام تصور ہے جس پر سماج نے مرد اور عورت کو دو خانوں یا دائروں میں بانٹ دیا ہے۔ اس نے مردوں کو مردانہ خصوصیات کی بنا پر پبلک سفیئر میں رکھا جبکہ عورتوں کو زنانہ صلاحیتوں کی بناء پر پرائیویٹ دائرہ میں رکھا۔ لیکن جو چند افراد ان متعلقہ خصوصیات یا معیار پر پورا نہیں اترتے یا فٹ نہیں ہوتے تو سماج انہیں باہر تو نہیں نکالتا (ہاں ان کے حقوق کی کوشش ایک الگ جائز مطالبہ ہے) لیکن وہ چند ایک کے لیے اپنے مجموعی بیانیے کو تبدیل نہیں کرتا۔ اور یہ بات اپنے آپ میں اس بات کی دلیل ہے کہ صنف معاشرے کی تعمیر نہیں (Gender is not Social constructed) بلکہ بیالوجی کی ہے کیوں کہ اگر سماج نے انسانی تعمیر کے خانے بنائے ہوتے تو کوئی ان سے باہر نہ ہوتا اور سب پورا اترتے۔ جنیاتی خرابی (Genetic Defect) یا ہارمونز کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ان کی صنفی خصوصیات اور رویّوں میں فرق نظر آتا ہے۔ لیکن تانیثیت پسندوں نے سب سے زیادہ مخالفت انہی خانوں کی ہے۔

سماج نے مرد اور عورت کے جو دو خانے بنائے ہیں انہیں پبلک اور پرائیویٹ کا نام دیا ہے۔ پبلک کے دائرہ کار میں سیاست، تجارت، فوج، پولیس، وغیرہ ہے جبکہ پرائیویٹ کے دائرہ کار میں گھریلو کام، بچوں کی نشوونما، کنبے کی دیکھ بھال شامل ہے۔[17] لیکن فیمینیسٹ کا اس پر اختلاف ہے اور وہ سماج پر یہ الزام لگاتی ہیں کہ مرد نے اپنی حاکمیت کو قائم رکھنے کے لیے پبلک سفیئر پر خود قبضہ کیا اور عورت کو گھر گرہستی کے لیے پرائیویٹ سفیئر میں دھکیل دیا۔ کیوں کہ پبلک سفیئر کے سب کاموں کا معاوضہ ہوتا ہے یوں مرد کماتا ہے اس لیے وہ پاور پوزیشن میں ہے۔ جبکہ عورت کے تمام گھریلو کام بغیر معاوضہ کے ہیں اور پیسوں کے لیے اسے مرد پر انحصار کرنا پڑتا ہے دوسرا ان کے کام میں پاور نہیں اس لیے مرد غالب اور عورت مغلوب ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ فیمنزم کی جنگ حقوق میں برابری کی ہے یا طاقت کے حصول کی؟ یہاں آکر ریڈیکل فیمنزم بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک وہ ہیں جو نظریات اور صنف سے پاک (Genderless) سماج کی تشکیل کی بات کرتے ہیں۔ یہ طبقہ تمثال نسواں (Feminist Critics) کی بنیاد رکھتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے مرد تخلیق کاروں کے تخیل نے تراشا، یا یوں کہیں کہ یہ (Androcentric) اور (Male Oriented) ہے۔[18] اس

کا کام مردوں کے تصورِ زن کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نئے افکار و نظریات کی کھوج لگانا ہے جو کہ موجودہ مرد مرکز سماج سے الگ ہوں اور عورت کی موجودہ حالت کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ طبقہ کسی حد تک حقوق کی بحالی کی ہی بات کرتا ہے۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو عورتوں کی خصوصیات اور رویے کو مردوں سے الگ اور برتر سمجھتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عورتوں میں جو خاص خصوصیات ہیں مردوں میں وہ نہیں لہٰذا انہیں اپنے عورت پن سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ چونکہ مردوں میں عورتوں جیسی خصوصیات ہے ہی نہیں اس لیے ان کے ادب میں نسائی جذبات و احساسات کو مرد سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے خواتین تخلیق کاروں اور مفکروں کے شعور میں آنکھ کھولی ہے۔ یہ صرف عورت کے تجربے پر بنیاد رکھتا ہے۔ اس لیے یہ (Female Oriented) ہے اور (Gyno Critics) کہلاتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے کہ اپنی الگ دنیا بسانے یا مادرانہ نظام کی بات کرتا ہے جہاں سماجی اصولوں کے ساتھ زبان بھی ان کی اپنی ہو۔ لیکن اینٹی فیمینیسٹ اسے ناممکن قرار دیتے ہیں کیوں کہ معاشرے کی تشکیل کے دو بڑے عناصر مرد و عورت میں دوری یا الگ دنیا اس میں بگاڑ کا باعث ہو گی۔ اُن کے نزدیک تانیثیت پسندوں کے اس رویے کی اصل وجہ کارپوریٹس ہیں۔ اُن کا مؤقف ہے کہ طاقت کا مرکز ہر دور میں تبدیل ہوتا آیا ہے۔ انسان کے غار، شکار اور قدیم زراعت کے دور سے لیکر صنعتی انقلاب سے پہلے تک طاقت کا معیار، جسمانی قوت اور زورِ بازو پر تھا۔ طاقت ور طبقہ ہی حکمران طبقہ ہوتا تھا۔ روشن خیالی پراجیکٹ کے تحت پہلی بار طاقت کا مرکز صنعت کار بنا۔ انسانی قوت کی جگہ مشین نے لے لی۔ طاقت کا اس سے اگلا پڑاؤ تاجر طبقہ یا کارپوریٹس کے ہاں تھا۔ ایک مکتبہء فکر کا خیال ہے کہ جدیدیت نے انفرادیت کو فروغ دیا اور انسان کو اجتماعیت اور روایت کی بجائے فرد فرد کیا۔ ہر فرد کو یہ اجازت دی کہ وہ اپنے بارے میں خود سوچے کیوں کہ اس سے پہلے مرکز مائل قوت کلچر و ثقافت تھی جو انسان کو جوڑ کر رکھتی تھی جب اس سے آزادی حاصل کی گئی تو پھر معاشرے کو انتشار سے بچانے کے لیے پولیس، عدلیہ، بیوروکریسی آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دور میں فرد کو سب سے بڑا مسئلہ اپنی شناخت کا تھا۔ اور یہ شاید کارپوریٹ سماج کی ضرورت بھی تھی کہ انسانیت کو فرد فرد کر کے ان سے وہ کام لیے جائیں جو ان کی طاقت میں اضافہ کریں۔ لہٰذا اس صنعتی دور میں صنعت کاروں کو ورک فورس کی زیادہ ضرورت تھی چونکہ کام مشین پر تھا جس میں زیادہ جسمانی قوت کی ضرورت نہیں تھی اس لیے انہوں نے

مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی صنعتوں میں کام کرنے کی ترغیب دلائی کیوں کہ یہ ان کی ضرورت تھی۔ یوں صنعتی دور میں خواتین کو گھر سے باہر کام کرنے کی آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا۔ جسے حقوق نسواں کا نام دیا گیا۔ اس طرح مرد و عورت میں ایک نظری دوری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔اب اگلا دور کمپیوٹر کا تھا جو عورت کے لیے صنعت سے بھی زیادہ بہتر تھا۔ یہ وہ دور تھا جب عورت نے اپنے پرائیویٹ دائرہ کار سے پبلک سفیئر میں قدم رکھا۔ان انہوں نے حقوق کی بات ایک طرف رکھ کر مرد و عورت کے فرق کو سرے سے ہی ختم کرنے کے لیے(Genderless) سوسائٹی کے قیام[19]پر زور دیا۔ لیکن اینٹی فیمینیسٹ یہ بات ماننے کو تیار نہیں کیوں کہ بائیولوجی ہی اس کی اجازت نہیں دیتی،لہٰذا یہ ممکن نہیں۔

اب اگر بحیثیت مجموعی ہم سوچیں تو سب اچھا نہیں ہے کیوں کہ کسی بھی تحریک کا جنم کسی بھی حالت کو لے کر انسان کے ذہن میں اٹھنے والے دو سوالات پر بنیاد کرتا ہے کہ کیا ہے؟اور کیسا ہونا چاہیے اگر حالت جو ہے اور اس کو ویسا ہی ہونا چاہیے تو سب اچھا ہے۔اگر ان دو سوالات کے درمیان خلا آتی ہے یعنی موجودہ حالت اور جو حالت ہونی چاہیے اس میں اگر فرق ہوتا ہے تو انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی اس حالت کو بدلنا چاہتا ہے اور اس کو ویسا کرنا چاہتا ہے جیسا اس کو ہونا چاہیے۔یہ بات صرف ایک فرد واحد کے لیے ہی نہیں بلکہ یہ ایک فرد سے لیکر ایک گروہ، طبقہ نوع یا معاشرہ پر بھی منطبق ہوتی ہے۔یوں اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک نظریے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس نظریے پر عمل درآمد کے لیے ایک تحریک جنم لیتی ہے۔لہٰذا

۱۔ عورت کو بحیثیت صنف اور جنس(Gender and Sex) کیسا ہونا چاہیے یا اس کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیے؟

۲۔ عورت بحیثیت صنف اور جنس(Gender and Sex) کیسی ہے اور اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے؟

اگر تو ان دو سوالات کے درمیان خلاء ہے تو یہ ایک مسئلہ ہے اور اس کا حل کرنے کے لیے ایک نظریے اور تحریک کی ضرورت ہے۔ تو پھر تانیثیت وہی ایک نظریہ اور تحریک ہے۔ لیکن اگر عورت کا مقصد برابری کے حقوق سے آگے بڑھ کر طاقت کا حصول ہے تو کل مرد اسی استحصال کا شکار ہوں گے۔ یہ مادیت کا زمانہ

ہے اور ساری دنیا ایک منڈی ہے اگر ہم صرف بحیثیت ایک مادہ پرست انسان کے سوچیں گے تو ظاہر ہے منڈی کے اندر ہر کوئی منافع کے لیے موجود ہے اور اس منڈی میں بہتر اور کامیاب شخص وہ ہے جو کم خرچ کرتا ہے اور زیادہ کماتا ہے لیکن معاشرے کی تشکیل کے لیے ہمیں یہ سوچنا ہو گا کہ ایک انسان کا منافع دوسرے کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ لہذا اگر ہمیں مل جل کر اور باہمی اعتماد والے ماحول میں رہنا ہے تو اس کے لئے ایک دوسرے کے لیے کچھ نہ کچھ کھونا سیکھنا پڑے گا۔ باہمی ربط والی زندگی گزارنے کے لیے ضروری نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو نیچا دکھائیں یا اس سے جیتنے کی کوشش کریں۔ اگر قدرت یا معاشرے نے ہمیں کچھ کردار دیے ہیں اور وہ ہماری طبیعت سے کسی حد تک میل بھی کھاتے ہیں تو معاشرے کی بقاء کے لیے ہمیں ان کو ادا کرنا چاہیے۔

دیکھا جائے تو فیمینزم کی اکثر شکلیں خود استحصال کا شکار ہیں۔ جس کو وہ آزادی سمجھتی ہے اصل میں عورت خود کو اسی طرح پیش کر رہی ہے جس طرح مرد چاہتا ہے۔ اس طرح عورت خود ہی اپنے استحصال کی وجہ بنی ہوئی ہے یعنی عورت جس چیز کو آزادی کہتی ہے یہ وہی کچھ ہے جو مرد چاہتا ہے۔ عورت کی موجودہ جنگ کی ایک ظاہری صورت یہ نظر آتی ہے کہ وہ مردانگی (Masculinity) یعنی مردوں ایسی خصوصیات اور مردوں ایسی طاقت چاہتی ہیں اگر یہ ساری چیزیں عورت کو مہیا کر دی جائیں اور وہ ایک مکمل مردانہ خصوصیات رکھنے والی عورت بن جائے تو کیا ایسا نہیں ہے کہ قدرت کا وہ حسن جو مونث صنف کے ساتھ منسلک ہے وہ سارے کا سارا ختم ہو کر رہ جائے گا اس لئے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قدرت نے ہر صنف میں اپنی اپنی خصوصیات رکھی ہیں ہمیں جس کے ساتھ رہنا سیکھنا ہو گا۔ یہ بات صرف مختلف خصوصیات کی حد تک ہے جب کہ مشترک خصوصیات پر قبضہ استحصال کے زمرے میں آئے گا۔

عہد حاضر میں جب سائنس اور ٹیکنالوجی نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ امورِ زمانہ کی انجام دہی کے لیے جسمانی طاقت سے زیادہ ذہنی صلاحیت پر انحصار ہے تو پھر کیوں نہ جسمانی طور پر بے شک کمزور مگر ذہنی سطح ہر متجسس طبعیت کی مالک خواتین کے زر خیز اذہان کو معاشرے کی ترقی کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پبلک اور پرائیویٹ دائروں کو توڑنے کی بجائے آپس میں جس قدر ہو سکے مدغم کیا جائے۔ پھر نہ مردانہ پن (Masculinity) کی حکمرانی ہو گی نہ زنانہ پن (Femineity) کے خدشات۔ اور مردوں کی مردانہ وجاہت اور عورت کی نسائی خوبصورتی بھی برقرار رہے۔ سد گرو کا کیا خوبصورت قول ہے کہ:

"A complete human being is in equilibrium between the masculine and feminine"

اس مجوزہ اشتراکِ عمل کی وضاحت اس تصویری ماڈل میں دیکھی جاسکتی ہے:

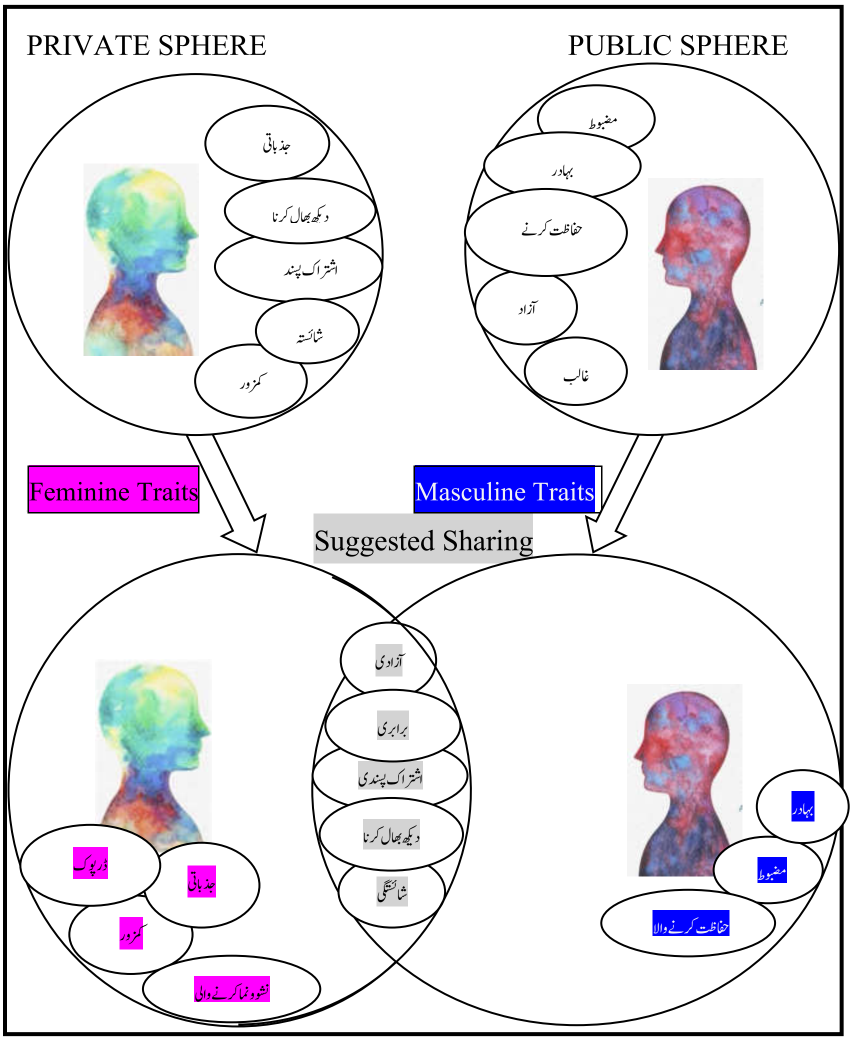

حوالہ جات:

1 Suzanne M Marilley, ***Woman suffrage and the origins of liberal feminism in the United States, 1820-1920*** (Harvard University Press, 1996).

2 Martha Gimenez, **The oppression of women**, (Hennessy and Ingraham, 1997).

3 عتیق اللہ، پروفیسر، **بیسویں صدی میں خواتین اردو و ادب**(نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء)۔

4 Rosemary Feurer, ***The Meaning of "Sisterhood": The British Women's Movement and Protective Labour Legislation, 1987-1900.***

5 Joan Didion, "The Women's Movement", in: ***The New York Times***, July 30, 1972.

6 Simn de Beauvoir, ***The Second Sex*** (New York: Vintage Book, 1973), P.283.

7 ***An Oakley Sex, Gender and Society (***2015), P.21:22.

8 George T Ellison, ***Biological determinism***, ResearchGate, July, 2017.

9 Simon Baron-Cohen, "***Testing the Empathizing Systemizing (E-S) theory of sex difference and the Extreme Male Brain (EMB) theory of autism in half a million people***", (Research Centre University of Cambridge, United Kingdom, June 27, 2018).

10 **خواتین اور مردوں کے دماغ کی ساخت مختلف:** تحقیق، وائس آف امریکہ، ۴ دسمبر ۲۰۱۳ء۔

11 ایضاً

12 William Reville, "Gender is not a social construct", in: ***THE IRISH TIMES***, 4 April, 2013.

13 زکریا ورک، ''قدیم دور میں عورت کی حیثیت''، مشمولہ: **جنگ**، ۲۲ مئی، ۲۰۱۹ء۔

14 ڈاکٹر مبارک علی، ''یونانی معاشرے میں عورت نامکمل انسان تھی''، مشمولہ: **انڈیپنڈنٹ اردو**، ۱۹ جون، ۲۰۱۹ء۔

15 کلیر جونز، ''سائنس کی تاریخ سے نکالی گئی خواتین''، مشمولہ: **انڈیپنڈنٹ اردو**، ۱۲ جنوری، ۲۰۱۹ء۔

16 Samantha Mclaren, **15 Gender Identity Terms You Need to Know to Build an Inclusive Workplace**, May 20, 2019.

17 Ulla Wischerman and Ilze Klavina Mueller, **Feminist Theories on the Separation of the Private and the Public**(University of Nebraska Press, 2004).

18 ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، ''نسوانی تنقید''، مشمولہ: **اردو ادب اور تانیثیت** (اسلام آباد: پورب اکادمی، س۔ن)، ص ۱۵۳۔

19 Daphna Joel, "It's Time for a World without Gender", in: **Scientific American**, October 10, 2019.